OPEN ACCESS
Journal of Semitic Religions
ISSN (Print): 2958-7514
ISSN (Online): 2958-7522
https://jsrpk.com/index.php/Journal

تفسیرِ تُستری اور تفسیرِ بیان القرآن میں توحید سے متعلق مباحث تصوف کا تجزیاتی و تقابلی مطالعہ

An Analytical and Comparative Study of Sufism in Tafsir Tustri and Tafsir Bayan al-Qur'an on Monotheism

Nasira Sharif
Ph.D Research Scholar, Department of Quran and Tafseer, Faculty of Arabic & Islamic Studies, AIOU

Dr. Hafiz Muhammad Arshad Iqbal
Assistant Professor, Department of Quran and Tafseer, Faculty of Arabic & Islamic Studies, AIOU, Islamabad, arshad.iqbal@aiou.edu.pk

Abstract

There are countless styles of interpretation or Tafseer of the Holy Qur'an, one of them is Tafsir e Ishari. Almost in every era and region, the work has been done on this style of Tafsir. The Arabic language Tafsir of the Great Qur'an, AL Qur'an ul Azeem is famous as "Tafsir Tustri" and it has the honor of being the first Tafsir in Tafsir-e-Ishari. The best example of Tafsir Ishari in the Urdu literature of the subcontinent is Bayan ul-Qur'an by Maulana Ashraf Ali Thanvi.

This paper aims to explain The belief of monotheism that is the basis and foundation of the religion of Islam. which means that Allah Almighty is characterized by all his attributes of divinity and perfections, and in those attributes and perfections, He is one and the only one. The Sufis of every age had perfect faith in monotheism. According to them, there is no difference in the nature, attributes, worship and actions of Allah. This research work aims to compare the similarities and differences between Tafsir Tustri and Tafsir Bayan Al-Qur'an, regarding existence and attributes of Allah. This paper is based on the authentic source and provides valuable information for better understanding of the subject.

Keywords: Sufism, Tafsir Ishari, Tustari, Monotheism, Bayan al-Qur'an, Comparative Study.

تمہید

تفسیر تُستری اور تفسیر بیان القرآن اشاری طرز پر لکھنے والی تفاسیر ہیں۔ "تفسیر القرآن العظیم "المشہور تفسیر تُستری، ابو عبداللہ محمد بن سہیل امام تُستریؒ کی مشہور صُوفیانہ تفسیر ہے۔ جبکہ بیان القرآن مولانا اشرف علی تھانویؒ کی اُردو زبان میں لکھی جانے والی

CC BY

ایک مایہ ناز تفسیر ہے۔

تفسیر تُستری اپنے منفرد انداز اور صوفیانہ نقطہ نظر کے لیے جانی جاتی ہے۔ تیسری صدی میں لکھی جانے والی یہ تفسیر اشاری طرز پر لکھی جانے والی پہلی تفسیر شُمار کی جاتی ہے۔ امام تُستریؒ کی تفسیر کا بنیادی مقصد قرآن کریم کی آیات کو صوفیانہ تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں بیان کرنا ہے۔ وہ آیات کی ظاہری تفسیر کے علاوہ ان کے باطنی معانی اور رموز و اشارات کو بھی بیان کرتے ہیں۔ امام تُستریؒ کے مطابق قرآن کریم صرف ایک کتاب ہدایت نہیں ہے بلکہ ایک رہنما بھی ہے جو انسان کو معرفت الٰہی کے راستے پر رہنمائی کرنے والا ہے۔ اُن کے مطابق قرآن کریم میں ظاہری اور باطنی دونوں معانی ہیں۔ ظاہری معنی وہ ہیں جو الفاظ سے براہ راست ظاہر ہوتے ہیں، جبکہ باطنی معنی وہ ہیں جو الفاظ کے اشارے اور کنایات سے اخذ کیے جاتے ہیں اور یہ باطنی معنی ظاہری معنی سے زیادہ اہم ہیں، کیونکہ یہ حقیقت اور حکمت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔

تفسیر بیان القرآن، مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ایک مشہور اردو تفسیر ہے، جسے 19 ویں صدی عیسوی میں تصنیف کیا گیا تھا۔ یہ تفسیر اپنے منفرد منہج اور صوفیانہ اسلوب کے لیے جانی جاتی ہے، جس میں سادہ اور عام فہم زبان، جامع اور عالمانہ تفصیل، اور صوفیانہ فکر و تصورات کا امتزاج شامل ہے۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اپنی تفسیر میں ایک سادہ اور عام فہم زبان استعمال کی ہے، جس کی وجہ سے یہ تفسیر عام قارئین کے لیے بھی قابلِ فہم ہے۔ وہ مشکل اصطلاحات اور پیچیدہ علمی مباحث سے گریز کرتے ہیں اور اپنی بات کو سادہ اور سلیس الفاظ میں بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگرچہ تفسیر بیان القرآن میں قرآن کی آیات کی جامع اور عالمانہ تفصیل بھی پیش کی گئی ہے۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے قرآن کی آیات کی لغوی، نحوی، اور صرفی تشریح کے علاوہ، ان کے تاریخی، سماجی، اور اخلاقی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ان خصوصیات کی وجہ سے، تفسیر بیان القرآن اردو میں سب سے مقبول تفسیروں میں سے ایک ہے۔ یہ تفسیر صوفیاء، علماء، اور قرآن میں دلچسپی رکھنے والے تمام لوگوں کے لیے پڑھنے اور غور و فکر کرنے کے قابل ہے۔

تفسیر تُستری اور تفسیر بیان القرآن، دونوں ہی قرآن کریم کی مشہور اور اہم تفسیریں ہیں، جنہوں نے صُوفی فکر اور ادب پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ امام تُستریؒ اور مولانا تھانویؒ کے درمیان تقریباً ایک ہزار سال کا فرق ہے۔ اس دوران، صوفی فکر اور ادب میں کئی تبدیلیاں آئیں، جنہوں نے ان دونوں تفاسیر کے منہج کو متاثر کیا۔ اس طرح امام تُستریؒ ایک صوفی اور زاہد تھے، جبکہ تھانوی ایک عالم دین اور صوفی تھے۔ ان کے مختلف علمی پس منظر نے ان دونوں تفسیروں کے منہج کو متاثر کیا۔ امام تُستریؒ اپنی تفسیر عوام کے لیے لکھ رہے تھے، جبکہ تھانوی اپنی تفسیر علماء اور صوفیاء کے لیے لکھ رہے تھے۔

امام تُستریؒ کا مقصد قرآن کی آیات کی صوفیانہ تفہیم پیش کرنا ہے اور صوفیوں کو ان آیات سے روحانی رہنمائی فراہم کرنا ہے۔ مولانا تھانویؒ کا مقصد قرآن کی آیات کی جامع اور عالمانہ تفہیم پیش کرنا ہے اور مسلمانوں کو ان آیات کی تعلیمات پر عمل کرنے کی ترغیب دینا ہے۔ امام تُستریؒ کی تفسیر صوفی فکر کے عروج کے دور میں لکھی گئی تھی، جبکہ تھانوی کی تفسیر ایک ایسے دور میں لکھی گئی تھی جب صوفی فکر کو کچھ مشکلات کا سامنا تھا۔ تاہم ان دونوں تفاسیر کی بہت ساری مباحث میں مماثلت پائی جاتی

ہے۔ ذیل میں ان دونوں تفاسیر کی روشنی میں توحید کی مباحث کو بیان کیا جاتا ہے۔

تفسیرِ تُستری اور تفسیر بیان القرآن میں توحید سے متعلق مشترکہ مباحث تصوف

تفسیر تُستری اور تفسیر بیان القرآن دونوں ہی قرآن کی قیمتی تفسیریں ہیں، جن کے اپنے منفرد منہج اور محاسن ہیں۔ تفسیر تُستری اگر ایک روحانی اور صوفیانہ تفسیر ہے تو تفسیر بیان القرآن صوفیانہ تفسیر ہونے کے ساتھ زیادہ علمی اور جامع تفسیر ہے۔

اسلام کا بنیادی عقیدہ توحید ہے باقی عقائد اس کی شاخیں ہیں جن سے اس ایک عقیدہ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ عقیدۂ توحید دینِ اسلام کی اساس اور بنیاد ہے، اِس کی صحت کے بغیر انسان اللہ تبارک و تعالیٰ کی رحمت اور حضور نبی اکرم ﷺ کی سچی محبت اور شفاعت کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ توحید تمام عقائد کی جڑ اور اصل الاصول ہے اور اعمالِ صالحہ دین کی فرع ہیں۔ درخت کی بقا فروع سے نہیں اصل سے ہوتی ہے۔ شاخوں اور پتوں سے درخت قائم نہیں رہتا۔ جس طرح دل و دماغ انسان کی اصل ہے اور آنکھ، ناک، کان، زبان، ہاتھ اور پاؤں فروع ہیں اِسی طرح دین اِسلام کی اصل عقائد ہیں اور اعمالِ صالحہ اس کی شاخیں ہیں۔ دین اِسلام کا پہلا اور بنیادی رکن توحید ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی تمام صفاتِ اُلوھیت اور کمالاتِ حقیقیہ سے متصف ہے اور اپنی اُن صفات و کمالات میں یکتا اور واحد ولاشریک ہے۔

ہر دور کے صوفیاء کا توحید پر کامل ایمان رہا ہے ان کے نزدیک اللہ کی ذات، صفات، عبادات اور افعال میں کوئی ثانی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی صفاتِ عالیہ کے بارے میں تفسیر تُستری اور تفسیر بیان القرآن میں جو ابحاث ہیں ان کا جائزہ لیا جائے گا۔ عقائد میں توحید کی مباحث بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ ان دونوں تفاسیر میں توحید سے متعلق نادر صوفی اشارات موجود ہیں، ان تفاسیر میں توحید کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا جائے گا۔ دونوں مصنفین کی آراء اور دلائل کا جائزہ لیا جائے گا چند مباحثِ توحید درج ذیل ہیں۔

توحید فی الذات

اللہ رب العالمین کی ذات تنہا اور یکتا ہے۔ کائنات کی کوئی شے کسی بھی حیثیت میں اُس کی ذات کا حصہ نہیں ہے۔ عبادت کے لائق صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، صرف اسی کی ذات اِس قابل اور لائق ہے کہ اِس کی عبادت کی جائے۔ اس کے علاوہ کوئی اور یہ حق نہیں رکھتا کہ اُس کی پرستش کی جائے۔

اس کا اظہار ویسے تو پورے قرآن میں جابجا کیا گیا ہے لیکن جس قدر جامع اور خوبصورت اظہار سورۃ اخلاص میں ملتا ہے اس کو دیکھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے۔ اسی سورۃ کے بارے میں امام تُستریؒ نے فرمایا کہ اس کا نام سورہ اخلاص اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس میں ہر اس چیز سے منع کر دیا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں۔ گویا خالص عبادت کا درس دیا گیا۔

﴿لَمۡ يَلِدۡ وَلَمۡ يُولَدۡ﴾[1]

(اس کی اولاد نہیں اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔)

اس آیت کی تفسیر میں آپؒ نے فرمایا:

فیکون ملکہ محدثا ،و ھو ایضاً اثبات الفردانیۃ،و نفی الاسباب عنہ ردا علی الکفار۔[2]

(ایسا اس لیے ہے کہ کوئی اس کا وارث نہ بنے کہ اس کی کوئی ایسی ملکیت ہو جو ختم ہونے والی ہو اور اس طرح کی وحدانیت کو ثابت کیا گیا ہے اور اس سے اسباب کی نفی کی گئی ہے کفار پر رد کرتے ہوئے۔)

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے بھی اس سورت کے بارے میں یہی کہا ہے کہ یہ سورت باوجود اپنے اختصار کے انواع معارف وعقائد توحید پر مشتمل ہے۔

سورۃ اعلیٰ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿سَبِّحِ ٱسۡمَ رَبِّكَ ٱلۡأَعۡلَى﴾[3]

(اے پیغمبر ﷺ) آپ ﷺ (اور جو مومن آپ کے ساتھ ہیں) اپنے پرودگار کے عالیشان نام کی تسبیح کیجیے۔)

"اس کا ظاہری معانی ہے اللہ تعالیٰ کا ضد اور شرک سے پاک ہونا۔ اور باطنی معانی نماز میں ذکر کے ذریعے اس کا مشاہدہ کرنا نہ کہ اس کے غیر کا۔"[4]

دونوں مفسرین کرامؒ کی رائے میں جب انسان ایک اللہ کی ہر شرک سے پاک عبادت کرے گا تو یقیناً اُس کو اپنی عبادات بالخصوص نماز میں بھی اخلاص حاصل ہو سکے گا۔

ایک اور جگہ امام تُستریؒ نے فرمایا:

"کلمۃ طیبۃ سے مراد کلمہ اخلاص ہے۔۔۔ مومن کے عمل کی جڑ کلمہ توحید ہے اور یہ ایسی جڑ ہے جو ثابت ہے اور مومن کی شاخ وہ عمل ہے جو آسمان کی طرف اُٹھایا جائے اور مقبول ہو، مگر یہ کہ اُس میں کمی رہ گئی ہو، لیکن اس کے عمل کی جڑ کبھی ختم نہیں ہوتی جو کلمہ توحید ہے جیسا کہ ہوائیں کھجور کی ٹہنیوں کو ہلاتی ہیں لیکن انہیں توڑتی نہیں ہیں۔۔۔ اور اللہ تعالیٰ کے خزانے میں توحید سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔"[5]

اس عقیدہ توحید کی جانچ کے لیے بڑوں بڑوں کے امتحانات بھی ہوئے۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب اپنی اولاد سے محبت ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کے ذریعے جانچا، جس پر ابراہیم علیہ السلام پورے اترے اور افضل محبت اللہ کی ہی پائی۔

"اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام پر اپنا فضل اور عصمت نازل فرمائی، یہاں تک کہ انہیں اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم دیا، کیونکہ اس سے مقصود ذبح کا حُصول نہیں تھا بلکہ مقصود تو کامل ترین سبب کے ذریعے دوسرے کی محبت سے باطن کو پاک صاف کرنا تھا۔ پھر جب ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے لیے باطن کو پاک وصاف کر لیا اور فطری عادت سے رجوع کر لیا تو ایک بڑا ذبیحہ فدیہ میں دے کر حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بچا لیا۔"[6]

اللہ تعالیٰ کی ذات کسی سمت میں مقید نہیں ہے۔ مندرجہ ذیل آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ کے چہرے کا اثبات ہوتا ہے مگر جیسے اس کی ذات اقدس کے لائق ہے۔ اللہ تعالیٰ کا چہرہ ہے مگر مخلوق کے چہروں کے مشابہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ اس مشابہت سے بلند وبرتر ہے۔

﴿فَأَيۡنَمَا تُوَلُّواْ فَثَمَّ وَجۡهُ ٱللَّهِۚ﴾[7]

(تم لوگ جس طرف منہ کرو اُدھر (ہی) اللہ کا رُخ ہے۔)

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس آیت کے متعلق فرمایا ہے:

"آیت دلیل ہے مسئلہ مظہریت کے صحیح ہونے پر۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی جہت کے ساتھ مقید نہیں۔"[8]

اللہ تعالیٰ جس طرح چاہے ظہور فرما سکتا ہے اور وہ عین حالت ظہور میں بھی اپنے اطلاق پر بھی باقی ہے یہاں تک کہ قید اطلاق سے بھی مطلق و منزہ ہے جیسا کہ سلف امت کا مذہب تھا تو جیسا کہ صوفیاء حضرات کا مسلک ہے تو وہ شخص ان تاویلات و تکلفات کا محتاج نہیں ہو گا۔

استوی علی العرش بھی مفسرین کے ہاں ایک اہم موضوع بحث رہا ہے۔ استواء کے معنی قائم ہونا، سیدھا ہونا کے ہیں اور بعض دفعہ اس سے مراد انتظام سنبھالنا بھی ہوتا ہے۔ استواء اللہ علی العرش کی کیفیت کو ٹھیک ٹھیک سمجھنا آسان نہیں اس کی حقیقی کیفیت اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

﴿ثُمَّ اسْتَوَى عَلَى الْعَرْشِ﴾[9]

(پھر عرش پر قائم ہوا۔)

مولانا اشرف علی تھانوی لکھتے ہیں: "سلف کا مذہب ایسے نصوص میں تفویض مراد کی حق سبحانہ و تعالیٰ کی طرف ہے یعنی جو استواء حق تعالیٰ نے مراد لیا ہے اور وہ حق تعالیٰ کی شان کے موافق ہے، وہی مراد ہے اور اکثر صوفیاء کا یہی مذہب ہے۔"[10]

یہاں جمہور سے مماثلت پائی جاتی ہے۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ سلف صالحین کی طرح اللہ تعالیٰ کے عرش پر مستوی ہونے کے قائل ہیں لیکن جہت کے نہیں۔ وہ استواء علی العرش سے متعلقہ آیات کی تاویل کرتے ہیں کیونکہ یہ عوام کی ضرورت ہے۔ ان کی تفسیر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عرش کو سلطنت سے تشبیہ دیتے ہیں۔[11]

قرآن کریم کی ایک آیت مبارکہ ہے:

﴿يَدُ ٱللَّهِ فَوۡقَ أَيۡدِيهِمۡ﴾[12]

(خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔)

ید اللہ کا لفظی معانی ہے "اللہ کا ہاتھ" اور اللہ کے ہاتھ کی کیفیت مخلوق کے علم و ادراک سے بُلند ہے اس لیے یہاں اللہ تعالیٰ کے فرمائے ہوئے الفاظ پر اکتفاء کرتے ہوئے اس بحث میں شامل نہ ہوا جائے کہ یہ کیسے ہو گا۔ مفسرین نے یہاں بھی استواء علی العرش کی طرح مختلف تاویلات گھڑی ہیں۔

"امام تُستریؒ نے اس کی تفسیر کرتے ہوئے ید اللہ کی مختلف تاویلات کی ہیں اور ایک جگہ اس سے مراد اللہ کا احسان لیا ہے یعنی مومنین کے بیعت کرنے کی وجہ سے اُن پر ہدایت و راہنمائی میں اللہ کا احسان ہے اور آپ کی بیعت اور اطاعت و فرماں برداری کرنے کی وجہ سے اُن کے لیے اللہ کا ثواب ہے۔"[13]

دلیل نقلی اسکی یہ ہو سکتی ہے كُلُّ شَيۡءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجۡهَهُۥ[14]

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے سوا ہر وجود ہالک ہے یعنی معدوم اور چونکہ کوئی وجود ذاتی نہیں اس لیے ہر وقت قابل عدم ہے اور ہر وجود کی حیثیت ایسی ہے جیسے وہ ہے ہی نہیں۔

امام تُستریؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ دونوں مفسرین اس بات پر بھی متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات پر کامل ایمان رکھنے والوں کو کرامات سے نوازتے ہیں جیسا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا:

﴿لَا يَحۡزُنُهُمُ ٱلۡفَزَعُ ٱلۡأَكۡبَرُ﴾[15]

(ان کو بڑی گھبراہٹ (یعنی نفخ ثانیہ سے زندہ ہونے کی) غم میں نہ ڈالے گی۔)

مولاناؒ فرماتے ہیں:

"اس سے وہ مقولہ ثابت ہوتا ہے کہ اہلِ اللہ کو فرح و دائم میسر ہوتا ہے اور ان کو جو عظمت کے سبب دونوں عالم میں یا عقاب کا خوف دنیا میں ہوتا ہے وہ اس کے منافی نہیں کیونکہ وہ مقتضی عبدیت کا ہے۔"[16]

اسی طرح جنہوں نے اللہ کے احکامات کی مخالفت کی تو اللہ نے بھی اُن کے دلوں سے نور معرفت کو بجھا دیا اور اللہ نے انہیں ان کے نفوس سے توحید کے چراغوں کو بجھا دیا، پھر وہ خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔

اللہ تعالیٰ کی صفات

اللہ تعالیٰ کی صفات عین ذات ہیں جب کہ انسان کے ساتھ ایسا معاملہ نہیں مثلاً اللہ کی تمام صفات عین ذات ہیں اور اللہ کے سوا کسی دوسری چیز کی صفات اس کی ذات نہیں ہو سکتیں۔ انسان اس وقت تک دیکھ سکتا ہے جب تک اس کے پاس دیکھنے کی صلاحیت ہے اور جب یہ صفت یعنی بینائی زائل ہو جاتی ہے تو وہ اس سے محروم ہو جاتا ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ اس سے یکسر مختلف ہے۔ جیسا کہ سورۃ کہف میں أَبۡصِرۡ بِهِۦ وَأَسۡمِعۡ 17 کی تفسیر میں مولانا اشرف علی تھانویؒ لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ کامل بصیر و سمیع ہے اور یہ کمال کامل اسی لیے ہے کہ کہ اس کی صفات عین ذات میں اس سے زیادہ درجہ کامل تعلق کا ہو نہیں سکتا۔"[18]

اسی طرح صوفیاء نے اس بات کو بھی ناپسند کیا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات میں اپنی رائے سے کلام کیا جائے اور محض قیاس آرائیوں سے کام چلایا جائے ایسی بحث کو علماء اور صوفیاء نے کافرانہ فعل میں شمار کیا ہے۔ اس کی دلیل مذکورہ آیت ہے:

﴿أَتَقُولُونَ عَلَى ٱللَّهِ مَا لَا تَعۡلَمُونَ﴾[19]

(یا اللہ کے ذمے ایسی بات لگاتے ہو جس کا تم (کسی دلیل سے) کوئی علم نہیں رکھتے۔)

اسی طرح اللہ کی ایک صفت

﴿وَهُوَ ٱلۡعَلِيُّ ٱلۡعَظِيمُ﴾[20]

(اور وہ عالیشان اور عظیم الشان ہے۔)

"میں علو کا حاصل نفی ہے صفات نقص کی اور عظمت کا حاصل اثبات ہے صفاتِ کمال کا۔"[21]

قرآن کی بے شمار آیاتِ کریمہ میں بیان ہونے والی صفاتِ خاصہ ہیں جو مخلوق کے لیے ثابت نہیں ہیں اسی طرح ذوق و ادب کی تسکین کے لیے اللہ تعالیٰ کی صفات کا ذکر کرنا ممنوع ہے۔ یہ موضوع ذہنی کُشتی کا موضوع نہیں اس میں ذرا سی بے احتیاطی سارے اعمال کے اکارت کر دینے کا باعث بن سکتی ہے اور یہی وہ تباہ کن بیماری ہے جس میں اکثر اہل علم اور تصوف مبتلا ہیں۔

سورۃ کہف میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿قُل لَّوۡ كَانَ ٱلۡبَحۡرُ مِدَادٗا لِّكَلِمَٰتِ رَبِّي لَنَفِدَ ٱلۡبَحۡرُ﴾[22]

(آپ کہہ دیجیے کہ اگر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لیے سمندر کی روشنائی ہو تو میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جائے (اور باتیں احاطہ میں نہ آویں)

اس آیت کی تفسیر میں امام تُستریؒ نے وضاحت کی کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ کی صفات کی کوئی انتہاء نہیں ہے لیکن ایک انسان کی رسائی وہاں تک ہے جہاں تک خود اللہ تعالیٰ چاہیں۔

"میرے رب کے علم اور اُس کے عجائب کبھی ختم نہ ہوں گے، اُس کے علم میں اس کی کتاب ہے، اگر قرآن کے ہر حرف کے بدلے بندے کے فہم کو ہزار فہم عطا کی جائے پھر بھی اللہ رب العزت کے اس علم تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس لیے کہ اُس کا کلام قدیم ہے، اُس کا کلام اس کی صفت ہے اور اس کی صفات کی کوئی انتہاء نہیں، جس طرح اُس کی ذات کی کوئی انتہاء نہیں۔ تو بندہ اُس کے کلام کو اتنا ہی سمجھتا ہے جتنا کہ وہ اپنے کلام کی سمجھ اپنے اولیاء کے دلوں پر کھولتا ہے۔"[23]

"الصمد کے بارے میں امام تُستریؒ نے یہ کہا کہ بے نیاز آقا وہ ہے کہ ہم حاجات اور پریشانیوں میں جس کا قصد کرتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے اللہ وہ ہے جس کا قصد کیا جائے۔"[24]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"اللہ کی طاقت اور قوت سے مراد اُس کے افعال ہیں، اُس کے افعال اس کے علم کے موافق ہوتے ہیں اور اس کا علم اس کی صفاتِ ذاتی میں سے ہے، بندہ کی طاقت و قوت ایک محدود وقت کے لیے ہوتی ہے اور تمام اوقات پر مالک اللہ ہی ہے۔"[25]

اللہ تعالیٰ ہر طرح کی صفات کمال سے متصف ہے، اور ہر طرح کے نقائص و عیوب سے منزہ ہے۔ مخلوقات میں سے کوئی بھی اس کا جیسا نہیں ہو سکتا ہے، جو صفات اس کے ساتھ قائم ہیں، ان کی حقیقت و مقتضیات کے ساتھ اللہ تعالیٰ مختص ہے۔ اللہ کی صفات، ان کے معانی و کیفیات کو ثابت کرنا ہے، مگر کیفیات کا علم کسی کو نہیں۔

﴿وَلَمۡ يَكُن لَّهُۥ كُفُوًا أَحَدُۢ﴾[26]

(اور نہ کوئی اس کے برابر کا ہے۔)

ولم یکن لہ احد کفواً علی جھۃ التقدیم۔[27]

(اس کا معنی ہے کہ قدیم ہونے کے اعتبار سے کوئی بھی اس کے برابر نہیں۔)

﴿إِنَّهُۥ كَانَ تَوَّابٗا﴾[28]

(وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔)

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی صفات کا احاطہ کرنا ممکن نہیں، اس بحر بیکراں سے ایک انسان اتنا ہی استفادہ کر سکتا ہے جتنا اللہ تعالیٰ خود چاہیں مذکورہ دونوں مفسرین کی آراء کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ دونوں کے ہاں اللہ کی صفات عین ذات ہیں، ان صفات پر ایمان رکھا جانا چاہیے اور دونوں کے نزدیک یہ بات درست نہیں کہ اللہ کی ذات و صفات کے بارے میں بغیر علم کے کلام کیا

جائے۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے متعلقہ جنتی آیات ہیں ان کے ظاہری معانی مُراد لیے جانے چاہییں۔

رویتِ باری تعالیٰ

دنیا میں اللہ تعالیٰ کی رویت کا اعتقاد رکھنا درست نہیں اس لیے کہ دنیا میں حق تعالیٰ شانہ کی رویت ناممکن ہے۔ مولانا نے اس کی دلیل یہ دی ہے کہ یہ نعمت تمام نعم اخرویہ سے افضل ہے۔ اور اس کا حصول یہاں ممکن نہیں[29] کیونکہ قرآن خود فرماتا ہے:

﴿لِّلَّذِينَ أَحۡسَنُواْ ٱلۡحُسۡنَىٰ وَزِيَادَةٞ﴾[30]

(جن لوگوں نے نیکی کی ہے ان کے واسطے خوبی (جنت) ہے اور مزید براں (خدا کا دیدار) بھی ہے۔)

وَزِيَادَةٞ کی تفسیر انہوں نے رویتِ باری تعالیٰ سے کی ہے۔

فرمایا:

﴿فَقَالُوٓاْ أَرِنَا ٱللَّهَ جَهۡرَةً﴾[31]

(اور یوں کہا تھا کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کو کھلم کھلا دکھادو۔)

اس میں اس شخص پر انکار ہے جو نشاۃ دینویہ میں وقوع رویت کا اعتقاد رکھے۔[32] یہود نے رویت باری تعالیٰ کا تقاضا کیا تھا جس کو قبول نہ کیا گیا۔

ایک اور جگہ فرمایا:

﴿لَّا تُدۡرِكُهُ ٱلۡأَبۡصَٰرُ﴾[33]

(اس کو تو کسی کی نگاہ محیط نہیں ہو سکتی۔)

سورۃ الاعراف میں فرمایا:

﴿قَالَ لَن تَرَىٰنِي﴾[34]

(تم مجھ کو (دنیا میں) ہرگز نہیں دیکھ سکتے۔)

اس آیت کی تفسیر میں مولاناؒ نے شب معراج کو مستثنیٰ قرار دیا ہے:

"یہ نص ہے کہ اس دنیا میں رویت الٰہیہ نہیں ہوتی جو شخص اس کا مدعی ہے یا دھوکہ میں ہے یا دھوکہ دیتا ہے اور شب معراج اس سے مستثنیٰ ہے۔"[35]

سہلؒ نے کہا ہے کہ اس اُمت کے مقربین کی علامات میں سے ہے کہ وہ مقرب لقاءِ حق اور دیدارِ حق سے بہرہ ور ہو جاتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کی تھی کہ میں تجھے ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔

﴿قَالَ رَبِّ أَرِنِيٓ أَنظُرۡ إِلَيۡكَۚ﴾[36]

(عرض کیا اے میرے پروردگار اپنا دیدار مجھ کو دکھلا دیجیے کہ میں آپ کو ایک نظر دیکھ لوں۔)

اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قَالَ لَن تَرَىٰنِي﴾[37]

(ارشاد ہوا کہ تم مجھ کو (دنیا میں) ہرگز نہیں دیکھ سکتے۔)

اس لیے کہ زمین کی کوئی مخلوق اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتی اگر دیکھے تو مر جائے حقیقت میں جس کا دل موسیٰ علیہ السلام کی طرح اللہ کے لیے خالص ہو جائے تو وہ اس کے دیدار اور وصال کا مشتاق ہو جاتا ہے۔

لیکن صرف حضرت محمد ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے تجلی اور انوارِ عظیمہ کو برداشت کرنے کی قوت عطا فرمائی اور یہ آپ ﷺ کو دوسرے انبیاء علیہم السلام پر افضل قرار دیتا ہے۔

﴿إِذۡ يَغۡشَى ٱلسِّدۡرَةَ مَا يَغۡشَىٰ١٦ ۝ مَا زَاغَ ٱلۡبَصَرُ وَمَا طَغَىٰ١٧ ۝ لَقَدۡ رَأَىٰ مِنۡ ءَايَٰتِ رَبِّهِ ٱلۡكُبۡرَىٰٓ﴾[38]

(جب اس سدرۃ المنتہی کو لپٹ رہی تھیں جو چیزیں لپٹ رہی تھیں نگاہ نہ تو ہٹی اور نہ بڑھی انہوں نے اپنے پرودگار کے بڑے بڑے عجائبات دیکھے۔)

اس کو امام تُستریؒ نے یوں بیان کیا:

ما مال الی شواهد نفسه، و لا الی مشاهدتها، و انما کان مشاهدا بکلیته ربه تعالیٰ،۔۔۔[39]

(آنکھ نہ شواہد نفس کی طرف مائل ہوئی نہ نفس کے مشاہدے کی طرف، وہ صرف اپنے خالق کے مشاہدۂ جمال میں محو تھی، اُس کی صفات کا نظارہ کر رہی تھی اور اُن صفات کا مشاہدہ کر رہی تھی جو آپ پر ظاہر ہو رہی تھیں اور اُس مقام پر آپ کے ثبات میں اضافہ کر رہی تھیں۔ اُس کی صفات کی جو نشانیاں بھی ظاہر ہوئیں اُن کا مشاہدہ کیا، لیکن آپ نہ مشہود سے غافل ہوئے اور نہ معبودِ حقیقی کے قُرب سے دور ہوئے بلکہ اُس سے صرف آپ کی محبت، شوق اور تابِ دیدار میں اضافہ ہوتا گیا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپ ﷺ کو تجلی دکھائی جبکہ موسیٰ علیہ السلام تجلی الٰہی کے وقت بے ہوش ہو کر گر پڑے، تو اس ضعف میں رسول کریم ﷺ نے نگاہِ قلب سے مشافہ دیدارِ الٰہی کے وقت اُس مقام کو طے کیا، تو آپ ﷺ علو و مرتبہ کی وجہ سے ثابت قدم رہے۔)

اللہ تعالیٰ کی نعمتِ عظیمہ اس کا دیدار ہے جس سے اصحابِ توحید سرفراز ہوں گے فرمایا:

﴿ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ بِـَٔايَٰتِنَا وَكَانُواْ مُسۡلِمِينَ۝٦٩ ٱدۡخُلُواْ ٱلۡجَنَّةَ أَنتُمۡ وَأَزۡوَٰجُكُمۡ تُحۡبَرُونَ﴾[40]

(یعنی (وہ بندے) جو ہماری آیتوں پر ایمان لائے تھے اور ہمارے فرماں بردار تھے تم اور تمہاری (ایمان دار) بیبیاں خوش خوش جنت میں داخل ہو جاؤ۔)

دیدار الٰہی کی لذت سے اپنے اولیاء کے لیے پردہ اٹھانے کے وقت۔ اور یہ اُس توحید کا بدلہ ہے جس کا اللہ تبارک و تعالیٰ نے اُن پر انعام فرمایا، اور وہ باقی رہنے والے کے ساتھ باقی رہنا ہے۔

امام تُستریؒ اس بات کے قائل ہیں کہ کفار پر جب حجت تمام کر دی جائے گی اور ان کو جہنم میں داخل کر دیا جائے گا تو مومنین کے لیے دیکھنے کی جگہیں کھول دی جائیں گی تو وہ کفار کو عذاب ہوتا دیکھیں گے اور اُن کی آنکھیں ٹھہر جائیں گی اور وہ دیکھ لیں گے کہ کفار کو ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ اس میں ان کی سزا یہ بھی ہو گی کہ ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کے دیدار سے محروم رہیں گے فرمایا:

﴿كَلَّآ إِنَّهُمۡ عَن رَّبِّهِمۡ يَوۡمَئِذٖ لَّمَحۡجُوبُونَ﴾[41]

(ہر گز ایسا نہیں یہ لوگ اس روز (ایک تو) اپنے رب کے دیدار سے روک لیے جائیں گے۔)

جہاں کفار کو دیدار الہیٰ سے روک دیا جائے گا وہیں ایمان والے اللہ کے دیدار سے لُطف اُٹھائیں گے۔

﴿هَلۡ ثُوِّبَ ٱلۡكُفَّارُ مَا كَانُواْ يَفۡعَلُونَ﴾[42]

(واقعی کافروں اُن کے کئے کا خوب بدلہ ملے گا۔)

و فيها دلالة بينة على اثبات الرؤية للمؤمنين خاصة۔[43]

(اس میں واضح دلالت ہے کہ رویتِ باری تعالیٰ خاص ہے مومنین کے ساتھ۔)

معرفتِ الٰہی

اللہ تعالیٰ کی ذات کی معرفت ایک علم ہے یہ اسی کو نصیب ہوتی ہے جو ایمان میں بڑھا ہو گا اور اسکی طرف کامل التفات رکھتا ہو گا ۔اس کا حُصول سب کے لیے ممکن نہیں۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے یہ بیان کیا ہے کہ جس طرح رویتِ الٰہی ممکن نہیں اس طرح اللہ تعالیٰ کی معرفت بالکنہ ممکن نہیں۔ اس کے ضمن میں فرعون کا سوال اور موسیٰ □ کی طرف سے صفاتِ الٰہیہ کا بیان ہے۔

﴿قَالَ فِرۡعَوۡنُ وَمَا رَبُّ ٱلۡعَٰلَمِينَ﴾[44]

(فرعون نے کہا کہ رب العالمین کی ماہیت (اور حقیقت) کیا ہے)

"فرعون نے لفظ ما سے ماہیتِ ربِ تعالیٰ سے سوال کیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے صفات سے جواب دیا اس سے وہ مسئلہ صاف ثابت ہو گیا کہ حق تعالیٰ کی معرفت بالکنہ نہیں ہو سکتی صرف بالوجہ ہو سکتی ہے۔"[45]

اللہ تعالیٰ کی معرفت انہی کو حاصل ہوتی ہے جو اہلِ علم ہوں۔ اس لیے انبیاء، شہداء اور صالحین میں سے، جن میں بعض کا درجہ بعض سے افضل ہے اور قُرب میں ان کا مقام اسی اعتبار سے ہے کہ اُن کے دل جس قدر اللہ کی معرفت سے قریب ہیں۔ اور جن کے دل دور ہیں تو اس کی وجہ معرفتِ الٰہی سے دُوری ہے۔

﴿وَتِلۡكَ ٱلۡأَمۡثَٰلُ نَضۡرِبُهَا لِلنَّاسِۖ وَمَا يَعۡقِلُهَآ إِلَّا ٱلۡعَٰلِمُونَ﴾[46]

(اور ہم ان (قرآنی) مثالوں کو لوگوں کے سمجھانے کے لیے بیان کرتے ہیں اور ان مثالوں کو بس علم والے ہی لوگ سمجھتے ہیں۔)

"علم عام ہے اور فقہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے خاص ہے، تو جو بذاتِ خود عارف ہوا اُس نے صرف طبعی نفس کو جانا اور اُسی کا قصد کیا اور جس نے اللہ تعالیٰ کے علم سے معرفت حاصل کی تو اللہ تعالیٰ اُس کے لیے اُس کی مراد کو جانتا ہے اور اُس کی جانب صرف اس لیے اشارہ ہوا کہ اُن کے دل حقیقت میں معرفتِ الٰہی سے دور تھے۔"[47]

پھر فرمایا:

﴿وَمَا قَدَرُواْ ٱللَّهَ حَقَّ قَدۡرِهِۦٓ﴾[48]

(اور (افسوس ہے کہ) ان لوگوں نے اللہ کی عظمت نہ کی جیسی عظمت کرنی چاہیے تھی۔)

"امام تُستریؒ کہتے ہیں اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ کی معرفت حاصل نہ کی اور نہ ہی اللہ کو پہچانا۔ اور باطن کی معرفت سب محتاجی میں ہے۔"[49]

اسی لیے صوفیاء کرامؒ نے باطن پر بہت زور دیا اور باطن نفس ہی تو ہے، اگر نفس کی اصلاح ہو گئی تو معرفت خداوندی کا درجہ بھی حاصل ہو جائے گا۔ امام غزالیؒ لکھتے ہیں:

"مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ صوفیاء کرام ہی معرفتِ الٰہی کی راہ پر گامزن ہیں۔ ان کی سیرت سب کی سیرتوں سے بہتر ہے۔ ان کا طریقہ سب کے طریقوں سے درست، ان کا خلق سب کے اخلاق سے پاکیزہ ہے۔"[50]

﴿وَٱللَّهُ ٱلْغَنِيُّ وَأَنتُمُ ٱلْفُقَرَآءُ﴾[51]

(اور اللہ تو کسی کا محتاج نہیں اور تم سب محتاج ہو۔)

گویا اللہ تعالیٰ کی معرفت انسانوں کو ان لوگوں کو حاصل نہیں ہو سکتی جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی ذات میں غور و فکر ہی نہیں کیا۔ انہوں نے اللہ کی ذات کا حق ویسے ادا کیا ہی نہ جیسا وہ حق رکھتا تھا۔ اُن کے دل اللہ کی یاد سے غافل تھے تو اللہ نے انہیں اپنی معرفت سے محروم کر دیا سوائے اُن کے جو عشقِ الٰہیٰ میں ڈوب گے اور اُس کی حقیقت تک پہنچ گے۔ لیکن جس نے اللہ تعالیٰ کی کماحقہ اس کی قدر اور تعظیم کی، اس کی صفاتِ کاملہ پر ایمان لایا تو اس کو اللہ کی رضا اور معرفت حاصل ہو جاتی ہے۔ جب انسان کا باطن تمام دنیوی کثافتوں اور آلائشوں سے پاک ہو جاتا ہے تو اس کے دل کے شفاف آئینے پر انوارِ الٰہیہ کا نزول ہونے لگتا ہے جو معرفتِ ربانی کی منزل کے حصول پر منتج ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے جب تک عرفان ذات نصیب نہیں ہوتا، معرفت الٰہیہ بھی حاصل نہی ہو سکتی۔ اسی لیے صوفیاء کرام کا نقطہ یہ ہے معرفتِ حق کا واحد ذریعہ معرفتِ نفس ہے، اس لئے تصوف کی جدوجہد معرفتِ نفس ہے اور نتیجہ معرفت حق۔

اسماء الٰہی کا بیان

جس طرح اللہ تبارک و تعالیٰ ذات کے اعتبار سے واحد اور یکتا ہے اسی طرح اسماء کے اعتبار سے بھی واحد اور یکتا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس میں کوئی اس کا شریک نہیں اور وہ شرک سے پاک ہے اس طرح اس کے خاص اسماء میں بھی کوئی اس کا شریک نہیں اللہ تعالیٰ کے اسماء اس کے اپنے بتائے ہوئے ہیں اور کسی کے لیے جائز نہیں کہ اپنی طرف سے ان ناموں میں اضافہ کرے۔ مولاناؒ کے نزدیک اس کی دلیل قرآن کریم کی یہ آیتِ مبارکہ ہے:

﴿فَلَا تَضْرِبُواْ لِلَّهِ ٱلْأَمْثَالَ﴾[52]

(سو تم اللہ کے لیے مثالیں مت گھڑو۔)

"اس میں دلالت ہے کہ ذات و صفات میں رائے اور ذوق سے کلام نہ کرنا چاہیے اور اس سے اسمائے الٰہیہ کا توقیفی ہونا بھی ظاہراً معلوم ہوتا ہے۔"[53]

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے صرف انہی ناموں کو اسمِ الٰہی کہا جانا چاہیے جو کتابِ الٰہیٰ اور رسول اللہ ﷺ سے ہم تک پہنچے ہیں اور انہی تمام اسماء حسنہ اور صفات علیا پر ایمان رکھنا جن سے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں خود کو متصف کیا ہے، یا اللہ تعالیٰ کو

اس کے رسول ﷺ نے متصف کیا ہے۔

امام تُستریؒ نے اسماء الٰہیہ کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔

سورۃ الاعراف میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَلِلَّهِ ٱلۡأَسۡمَآءُ ٱلۡحُسۡنَىٰ فَٱدۡعُوهُ بِهَا﴾[54]

(اور اچھے اچھے نام اللہ ہی کے لیے ہیں سو ان ناموں سے اللہ ہی کو موسوم کیا کرو۔)

ان وراء الاسامی والصفات صفات لا تخرقها الافهام،لان الحق نار تنصرم لا سبیل الیہ، و لا بد من الافتحام فیہ۔ [55]

(بے شک ہر نام اور صفات کے بعد کچھ ایسی صفات ہیں جو سمجھ سے بالاتر ہیں، جہاں تک کسی کی رسائی نہیں اور وہاں تک پہنچنے کے لیے محنت و مشقت ضروری ہے۔)

بسم اللہ کی تفسیر میں امام تُستریؒ فرماتے ہیں:

الباء بها الله عزوجل ،واسین سناء الله عزوجل ،والمیم مجد الله عزوجل ۔
والله هوا لاسم الاعظم الذی حوی الاسماء کلها،۔۔۔[56]

"الباء؛بھا اللہ۔ اللہ کا جمال مراد ہے، اور سین سے مراد؛ سناء اللہ۔ اللہ کا جلال مراد ہے میم سے مجد اللہ۔ اللہ کی بڑائی اور عظمت مراد ہے اور اللہ اسم اعظم ہے جو تمام اسماء پر حاوی ہے اور اُن کو سمیٹے ہوئے ہے۔ اور الف اور لام کے درمیان حرف ہے جو غیب کے غیب اور راز کے راز جو کہ راز میں ہے اور حقیقت کی اس حقیقت جو کہ اصل حقیقت ہے اس کی جانب اشارہ کر رہا ہے جس تک اس کا فہم رسائی حاصل کر سکتا ہے جو تمام عیوب سے پاک ہو گیا اور صرف حلال کھایا اور ایمان کے تقاضوں پر قائم رہا۔ اور الرحمن ایسا اسم ہے کہ اس کے الف اور لام کے مابین اشارہ دینے والے ایک حرف کی خاصیت ہے اور الرحیم جو کہ بندوں پر ان کے رزق کے سلسلے میں اپنے قدیم علم کی رو سے انتہائی مہربان ہے۔"

درحقیقت ان دو ناموں سے اللہ تعالیٰ کی صفتِ مہربانی جھلکتی ہے اور ان کے ذریعے سے وہ اپنے مومن بندوں سے مایوسی کو دور فرما رہے ہیں۔

حلول واتحاد کا بطلان

اللہ تعالیٰ کی ذات میں حلول واتحاد محال ہے بنی اسرائیل نے بچھڑے کی پوجا اسی نظریے پر کی تھی کہ اس میں خدا حلول کر گیا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کی گرفت فرمائی ہے۔

﴿إِنَّكُمۡ ظَلَمۡتُمۡ أَنفُسَكُم بِٱتِّخَاذِكُمُ﴾[57]

(بے شک تم نے اپنا بڑا نقصان کیا ہے اپنے اس گئوسالہ (پرستی) کی تجویز سے۔)

بنی اسرائیل نے بچھڑے کو معبود بنا کر جو غلطی کی وہ اعتقادی تھی نہ کہ عملی۔ اور یہ شرک ہے جس کو قرآن نے ظلمِ عظیم سے تعبیر کیا ہے۔

"اس میں دلیل ہے کہ حق تعالیٰ کی جناب میں حلول محال ہے ورنہ بنی اسرائیل جو کہ عجل میں حق تعالیٰ کے حلول کے معتقد تھے معذور ہوتے کیونکہ یہ ان کی غلطی موقع غلطی میں ہوتی۔ اس کا حقیقت سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں تھا اس لیے توبہ کے لیے سخت ترین شرط عائد کی گئی۔"[58]

گویا اللہ تعالیٰ کا کسی دوسرے جسم میں حلول کرنا کافرانہ خیال اور عقیدہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَلَا تَقُولُواْ ثَلَٰثَةٌۚ﴾[59]

(اور یوں مت کہو کہ تین ہیں۔)

"حلول و اتحاد کے بطلان پر صریح دال ہے جیسا کہ بعض جہلاء صوفیاء معتقد ہیں۔"[60]

اسی طرح ایک اور جگہ پر اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے اعتقاد کو رد کیا ہے جو حق اور خلق میں اتحاد کے قائل ہیں۔ فرمایا:

﴿لَّقَدۡ كَفَرَ ٱلَّذِينَ قَالُوٓاْ إِنَّ ٱللَّهَ هُوَ ٱلۡمَسِيحُ ٱبۡنُ مَرۡيَمَ﴾[61]

(بلاشبہ وہ لوگ کافر ہیں جو یوں کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عین مسیح ابن مریم ہے۔)

اسی طرح کے الفاظ اسی سورت کی آیت نمبر 74 میں بھی استعمال ہوئے ہیں۔

امام تُستریؒ بھی مولانا اشرف علی تھانویؒ کی طرح حلول و اتحاد کے نظریے کے مخالف نظر آتے ہیں۔ بلکہ وہ اس تعلق کو معرفتِ الٰہی کا نام دیتے ہیں جس سے بندہ وصل حق سے سرفراز ہوتا ہے اور یہاں پر تمام جاہل صوفیاء کے عقیدہ حلول کا ابطال بھی ثابت ہو جاتا ہے۔

﴿وَإِيَّيَ فَٱرۡهَبُونِ﴾[62]

(اور صرف مجھ ہی سے ڈرو۔)

"جب امام تُستریؒ سے رھبت کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا کہ اس سے مراد وہ نور بصیرت و معرفت ہے جو دل میں موجود رہتا ہے۔۔۔ جب بندہ تقویٰ کی طرف مائل ہوتا ہے تو اُسے نورِ یقین حاصل ہوتا ہے اور بندہ اصلِ بارگاہ ہو جاتا ہے اور توحید پر استقامت نصیب ہو جاتی ہے۔ یعنی اس کا دل اپنے مولا کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ نورِ یقین سے علم یقین کا درجہ پاتا ہے۔ اور یہ وصول الی اللہ تعالیٰ ہے۔ یہ یقین نور یقین یا علم یقین نہیں ہوتا اور نہ ہی مخلوق ہوتا ہے۔ اس لیے کہ یہ ذاتِ حق تعالیٰ کے نور سے ایک نور ہوتا ہے۔ یہ نہ حلول کے معنی میں نہ جمع و اتصال کے بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ بندہ رب تعالیٰ کی توحید اور اللہ و رسول کی اطاعت کے ذریعے وصول حق سے مشرف ہوتا ہے۔ اب معرفتِ الٰہیٰ میں بندہ کو جتنی بصیرت حاصل ہو گی اتنا ہی تقویٰ اور رہبت سے سرفراز ہو گا۔"[63]

گویا ڈر اور خوف میں بھی نفس کی مخالفت کی جائے جتنی زیادہ نفس کی مخالفت ہو گی، تقویٰ کا اتنا ہی بڑا حصہ نصیب ہو گا یہی کمال یقین اور انتہائے وصول الی اللہ تعالیٰ ہے۔

نسبت مع اللہ کا حُصول

اللہ تعالیٰ کے ساتھ جس کا تعلق مضبوط ہو جائے گویا اس نے مضبوط حلقے کو تھام لیا جس کو کسی طرح شکستگی نہیں۔ ایسا تعلق دائمی اور پائیدار ہوتا ہے۔ جب بندے کا تعلق اللہ کے ساتھ مستحکم ہو جاتا ہے تو اس کو دنیا کا کوئی نقصان خوف ڈر میں مبتلا نہیں کر سکتا کیوں کہ ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ کا قُرب حاصل ہو جاتا ہے جس کا اشارہ اس آیت میں ہے:

﴿قَالَ لَا تَخَافَآۖ إِنَّنِي مَعَكُمَآ أَسۡمَعُ وَأَرَىٰ﴾ [64]

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَيُؤۡمِنۢ بِٱللَّهِ فَقَدِ ٱسۡتَمۡسَكَ بِٱلۡعُرۡوَةِ ٱلۡوُثۡقَىٰ لَا ٱنفِصَامَ لَهَا﴾[65]

(اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ خوش اعتقاد ہو (یعنی اسلام قبول کرے) تو اس نے بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا۔ جس کو کسی طرح کی شکستگی نہیں (ہو سکتی)۔)

"لَا ٱنفِصَامَ لَهَا میں دلیل ہے اس پر کہ نسبت مع اللہ (جو کہ عروۃ الوثقی ہے حصول کے بعد منقطع نہیں ہوتی)[66]

ایسے لوگوں کو اللہ کی ولایت حاصل ہو جاتی ہے اور ان کا تعلق مخلوق کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کے زیادہ رعایت کے قابل ہوتا ہے۔ اس میں دلیل ہے اس بات پر کہ نسبت میں اللہ کے حصول کے بعد آسانی سے منقطع نہیں ہوتی جب اللہ کے ساتھ ایک بار نسبت قائم ہو گی تو وہ ختم نہیں ہوتی لیکن اس نسبت کے قائم ہونے کے لیے ایک مومن کو طویل عرصے تک ایک جنگ لڑنا پڑتی ہے یہ آسانی کے ساتھ حاصل نہیں ہوتی لیکن جب اللہ نے فضل سے یہ عطا کر دے تو یہ مستحکم اور مضبوط ہوتی ہے۔ یہی بات سورۃ آل عمران آیت 101 میں بھی ذکر ہوئی ہے۔

گویا اللہ سے تعلق کو مضبوطی سے پکڑنے والا ہلاکت و خسران سے محفوظ رہتا ہے۔ بندہ جب اللہ کے احکام اور قضاء پر راضی رہنا سیکھ لیتا ہے تو دُنیاوی لذتوں کو ترک کر کے اللہ کے ساتھ خوب صورت تعلق میں جُڑ جاتا ہے یہ تعلق ایک ایسی رسی ہے جس کو ٹوٹنا نہیں۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ ٱللَّهُ وَرَسُولُهُۥ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ﴾[67]

(تمہارے دوست تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور ایمان دار لوگ ہیں۔)

"اللہ تعالیٰ کی مدد کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسے چن لیتا ہے جسے اپنا ولی بناتا ہے پھر نبی کریم ﷺ کو آگاہ فرما دیتا ہے کہ وہ مومنین کا مددگار ہے۔ لہٰذا ان پر ضروری ہے کہ آپ بھی اُس کے دوست (مددگار) ہوں، اللہ تعالیٰ اور مومنین جس کے مددگار ہیں۔"[68]

اللہ کو مضبوط پکڑنے کی حقیقت یہ ہے کہ جو ظاہری اسباب ہیں ان کو مکمل طور پر چھوڑ کر ان سے دستبردار ہو کر اللہ کی طرف یکسو ہو اجائے اور اللہ تعالی کو مضبوط پکڑنا یہ ہے کہ اللہ کے سوا سب کچھ چھوڑ کر صرف اس کی پناہ میں آجایا جائے اور اہل حقائق کا مضبوط پکڑنا یہ ہے کہ یہ مشاہدہ ہو کہ ہم قبضے میں ہیں اور اس کی توجہ ہماری ہی طرف ہے۔

اطاعت و محبتِ الٰہی

اللہ تعالیٰ کی محبت درحقیقت انسان کو اطاعت و فرماں برداری کی طرف مائل کرتی ہے اور رب کو بھی اپنے اُس بندے سے سب سے زیادہ محبت ہوتی ہے جو اس کی فرماں برداری کرتا ہے۔ صوفیا کرامؒ اپنی تعلیمات میں جس چیز پر سب سے زیادہ زور دیتے ہیں وہ محبتِ خداوندی ہے۔ یہی انسان کو اُس کی اطاعت پر بھی مجبور کرتی ہے اور یہی اُسے اللہ کی نافرمانی سے روکتی ہے۔

﴿وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ١٧﴾ [69]

(اور جو مومن ہیں ان کو صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ نہایت قوی محبت ہے۔)

یہ آیت ان کی اپنے رب سے دوستی پر مشتمل ہے، اس لیے کہ وہ اپنے رب سے محبت رکھتے ہیں، اور ایک صوفی کے دل میں اللہ کی محبت سب سے زیادہ رچی بسی ہوتی ہے قلب کی گہرائیوں میں یہ محبت اپنی خوشبوئیں بکھیرتی اور روح کو معطر کرتی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے بھی فرمایا:

من احب للہ وابغض للہ واعطی للہ ومنع للہ فقد استکمل الایمان [70]

(جس شخص نے اللہ کے لیے محبت کی، اللہ کی خاطر بغض رکھا، اللہ کی رضا کی خاطر عطا کیا اور اللہ کے لیے روک لیا تو اس نے ایمان مکمل کر لیا۔)

"صوفیاء حضرات اپنی تعلیمات میں سب سے زیادہ جس چیز پر زور دیتے ہیں وہ عشق و محبتِ خداوندی ہے، کیونکہ محبت ہی ایک ایسی چیز ہے جو محب کو اپنے محبوب کی اطاعت پر مجبور کرتی ہے اور اس کی نافرمانی سے روکتی ہے اور محب کے دل میں محبوب کی رضا کی خاطر ہر مصیبت و تکلیف کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنے کی قوت و صلاحیت پیدا کرتی ہے، اور محبت ہی وہ چیز ہے جو محب کو مجبور کرتی ہے کہ وہ ایسا عمل کرے جس سے محبوب راضی ہو اور ہر اس عمل و کردار سے باز رہے جس سے محبوب ناراض ہو، چنانچہ صوفیا حضرات اگر زہد، تقویٰ، عبادت، ریاضت اور مجاہدے اختیار کرتے ہیں تو ان کا مقصد صرف اور صرف خدا کی رضا حاصل کرنا ہوتا ہے۔ وہ جنت کی لالچ یا جہنم کے خوف سے خدا کی بندگی نہیں کرتے، چنانچہ حضرت رابعہ بصریہؒ اپنی ایک دعا میں فرماتی ہیں: "خدایا! اگر میں تیری بندگی جنت کے لیے کرتی ہوں تو مجھے اس سے محروم رکھنا، اگر میں جہنم کے خوف سے تیری عبادت کرتی ہوں تو مجھے اس میں جھونک دینا، لیکن اگر میں تیری بندگی تجھے پانے کے لیے کرتی ہوں تو مجھے اپنے آپ سے محروم نہ رکھنا۔" [71]

امام تُستریؒ نے کہا:

"یہ اہل ایمان کی افضلیت ہے کیونکہ انہیں معرفت حاصل ہوتی ہے جس کی وجہ سے ذکرِ الٰہی کی طرف مائل اور اُس پر قائم رہنے کے اسباب میسر ہوتے ہیں، یہ مقام عارفین اہلِ محبت کا مقام ہوتا ہے، کیونکہ محبت اللہ کی طرف سے ایک عنایت ہے۔ اور اس محبت کی علامت یہ ہے کہ اس کی اطاعت کو اپنایا جائے۔" [72]

﴿أَفَلَا يَنظُرُونَ إِلَى ٱلْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ١٧﴾ [73]

(کیا وہ اُونٹ کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح (عجیب طور پر) پیدا کیا گیا ہے۔)

وهو فی الباطن امر للمؤمنین بالتذلل والافتقار الیہ ،فقال :انظروا الی الابل کیف خلقت ،مع خلقتها و قوتها --- ۔ [74]

"اس آیت کے باطنی معانی ذکر کرتے ہوئے امام تُستریؒ مومنوں کو اللہ کی طرف عاجزی اختیار کرنے کی تلقین کی ہے اور کہا ہے اُونٹ کی طرف دیکھو کہ کیسے اس کو پیدا کیا گیا ہے باوجود اس کی قوت اور طاقت کے کیسے اس کو ایک بچہ ہنکا کر لے جاتا ہے اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اپنے رب کے لیے فرمانبردار اُونٹ کی طرح ہو جاؤ۔"

باری تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَلَا تَطۡرُدِ ٱلَّذِينَ يَدۡعُونَ رَبَّهُم بِٱلۡغَدَوٰةِ وَٱلۡعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجۡهَهُۥ﴾[75]

(اس اُمید پر کہ وہ ڈر جائیں اور ان کو نہ نکالیے جو صبح وشام اپنے پرودگار کی عبادت کرتے ہیں جس سے خاص اس کی رضا ہی کا قصد رکھتے ہیں۔)

مفسرؒ نے فرمایا:

"یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی وخوشنودی چاہتے ہیں اور ایک لمحہ کے لیے اُس سے غافل نہیں ہوتے۔ پھر فرمایا: کہ لوگوں میں سب سے زیادہ زاہد و متقی وہ شخص ہے جس کی غذا سب سے سُتھری ہو، اور لوگوں میں سب سے عبادت گزار شخص وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجاآوری اور اس کی منع کردہ چیزوں سے باز رہنے میں لوگوں میں سب سے زیادہ کوشش کرتا ہو، اور اللہ تعالیٰ کو سب سے پیارا وہ شخص ہے جو اس کی مخلوق کا سب سے زیادہ خیر خواہ ہو۔[76]

اللہ کی محبت کے مقابلے میں کوئی محبت نہیں ہونی چاہیے، اس سے بڑھ کر کسی سے محبت نہیں ہونی چاہیے، اس کی محبت کے تابع رہ کر کسی سے محبت کی ممانعت نہیں۔ قرآن کریم میں ارشاد ملتا ہے:

﴿وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ أَشَدُّ حُبّٗا لِّلَّهِۗ﴾[77]

(اور جو مومن ہیں ان کو صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ نہایت قوی محبت ہے۔)

بقول مولانا اشرف علی تھانویؒ:

"اس میں دلالت ہے کہ کہ مطلق محبت غیر اللہ کی محبت الٰہیہ کے منافی نہیں ہے جیسا کہ لفظ اشد سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی درجے میں دوسرے کی محبت بھی ہے۔"[78]

اللہ کی مخلوق سے محبت اللہ کی محبت کے منافی نہیں ہے بلکہ اللہ کی رضا کی خاطر اللہ کی مخلوق سے محبت کرنا درست فعل ہے مثلاً اپنے اہل خانہ کے ساتھ محبت، عام لوگوں سے محبت۔ البتہ بندہ مومن کو سب سے زیادہ محبت اللہ کے ساتھ ہونی چاہیے اللہ کی مخلوق سے محبت اس لیے ہوتی ہے کہ اس کی حیثیت اللہ کے عیال کی سی ہے۔ اللہ کے بندوں سے محبت اللہ کی رضا سے غافل نہیں کرتی بلکہ اس میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ لیکن جب یہی محبت جو اللہ کی طرح ہونے لگے یا اس سے بڑھ کر تو اس وقت یہ شرک فی المحبت کے زُمرے میں شمار ہو گا جیسا کہ آیت میں ذکر ہے:

﴿وَمِنَ ٱلنَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِن دُونِ ٱللَّهِ أَندَادٗا يُحِبُّونَهُمۡ كَحُبِّ ٱللَّهِۖ﴾[79]

(اور ایک آدمی وہ ہیں جو علاوہ خدا تعالیٰ کے اوروں کو بھی شریک (خدائی) قرار دیتے ہیں۔ ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ سے رکھنا (ضروری) ہے۔)

اس آیت سے امام تُستریؒ نے یہ سمجھا کہ اللہ کی محبت ہی تمام محبتوں پر غالب ہونی چاہیے اور اس کی نشانی یہ ہے کہ جب ایسا ہو تو انسان اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں بخوشی مشغول ہو جاتا ہے اور مولاناؒ نے یہ نکتہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ بیک وقت دو محبتوں کا پایا جانا ممکن ہے اور یہ غلط نہیں جب تک دوسری محبت اللہ تعالیٰ کی محبت سے زیادہ شدید نہ ہو جائے، اس میں کوئی قباحت نہیں۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے نزدیک بھی غیر اللہ کی محبت اللہ کی محبت کے منافی نہیں ہے جیسا کہ لفظ اشد سے ظاہر ہوتا ہے کسی بھی دوسرے سے محبت ہو سکتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی محبت شدید ہونی چاہیے کیونکہ اسی محبت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت آسان ہو جاتی ہے اور یہ فطرت کا تقاضا بھی ہے اللہ سے محبت ایسی چیزیں جس میں ساری صفات اور سارے کمالات موجود ہوں اللہ سے والیانہ محبت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کو آسان بنا دیتی ہے، یہ باقی محبتوں کو اس محبت کے تابع کر دیتی ہے جو سارے فساد کی جڑ ہوتی ہیں اللہ کی یہ محبت اور دل اور روح کو طاقت بخشتی ہے اللہ سے والہانہ محبت وہ خزانے لاتی ہے جس کے سامنے ہر چیز بہہ جاتی ہے اللہ کی محبت راز اشکار کرتی ہے۔ اللہ کی محبت مجاہدوں کی خصوصیات میں سے خصوصیت ہے اللہ کی محبت کے بے پناہ ثمرات ہیں وہ اتنی آسانی سے حاصل نہیں ہوتی، بڑے مجاہدے کرنے پڑتے ہیں عوام وخواص کو یہ بنیادی اور اُصولی نقطہ سمجھنے کی ضرورت ہے اور جب انسان کو اللہ کے ساتھ ایسی محبت ہو جاتی ہے تو اس کے لیے پھر کسی بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتا حتی کہ اپنی پسندیدہ چیز مال جس کو وہ انتہائی محنت کے ساتھ کماتا ہے اور اس کی ساری کوششیں اسی کے لیے ہوتی ہیں وہ بھی اللہ کی راہ میں قربان کر دیتا ہے یہ بھی اس کی مجاہدے کا حاصل ہوتا ہے جب انسان اپنی خواہشات کو اللہ تبارک و تعالیٰ کی محبت میں ختم کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اپنی محبت کے ذریعے سے بقانصیب کرتے ہیں جس سے اس کی دنیاوی اور اُخروی زندگی سُدھر جاتی ہے۔

نتائج

اس تحقیقی مقالے کے نتائج درج ذیل ہیں:

1- ہر دور کے صوفیاء کا توحید پر کامل ایمان رہا ہے ان کے نزدیک اللہ کی ذات، صفات، عبادات اور افعال میں کوئی ثانی نہیں۔

2- صوفیاء کرامؒ نے باطن پر بہت زور دیا اور باطن نفس ہی تو ہے، اگر نفس کی اصلاح ہو گئی تو معرفت خداوندی کا درجہ بھی حاصل ہو جائے گا۔ صوفیاء کرام کا نقطہ یہ ہے معرفتِ حق کا واحد ذریعہ معرفتِ نفس ہے، اس لئے تصوف کی جدوجہد معرفتِ نفس ہے۔

3- مولانا تھانویؒ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات میں رائے اور ذوق سے کلام نہ کرنا چاہیے اور اس سے اسمائے الہیٰہ کا توقیفی ہونا بھی ظاہراً معلوم ہوتا ہے۔

4- آیت الکرسی کے ابتدائی حصہ کو امام تُستریؒ نے اللہ تعالیٰ کا اسمِ اعظم قرار دیا ہے، جو آسمان پر مشرق سے مغرب تک سبز نور سے لکھا ہے۔

5- اللہ کو مضبوط پکڑنے کی حقیقت یہ ہے کہ جو ظاہری اسباب ہیں ان کو مکمل طور پر چھوڑ کر ان سے دستبردار ہو کر اللہ کی طرف یکسو ہوا جائے اور اللہ تعالیٰ کو مضبوط پکڑنا یہ ہے کہ اللہ کے سوا سب کچھ چھوڑ کر صرف اس کی پناہ میں آجایا جائے اور اہل حقائق کا مضبوط پکڑنا یہ ہے کہ یہ مشاہدہ ہو کہ ہم قبضے میں ہیں اور اس کی توجہ ہماری ہی طرف ہے۔

6- دونوں مفسرین کے مطابق اللہ تعالیٰ کی صفات عین الذات ہیں۔ اور ان میں تخمینات سے گریز کرنا چاہیے۔ تاہم ان پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔

7- دونوں مفسرین اس بات کے قائل ہیں کہ رویتِ باری تعالیٰ اس دنیا میں ممکن نہیں۔

8- اللہ تعالیٰ کی معرفت انہیں کو حاصل ہو گی جو اہل علم ہوں گے۔ مولاناؒ کے نزدیک یہ معرفت بالکنہ نہیں ہو سکتی۔

9- اللہ تعالیٰ کے اسماء کے حوالے سے مفسرین نے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے خاص ناموں میں اس کا کوئی شریک نہیں، بلکہ اس کے یہ نام اپنے بتائے ہوئے ہیں اور کسی کے لیے ان میں اضافہ جائز نہیں۔

10- اللہ کی مخلوق سے محبت اللہ کی محبت کے منافی نہیں ہے لیکن اللہ کی محبت تمام محبتوں پر غالب ہونی چاہیے۔

11- مولاناؒ نے اللہ کے لیے مثالیں ٹھہرانے کو جائز قرار دیا ہے۔ جبکہ امام تُستریؒ نے اس پر خاموشی اختیار کی ہے۔

12- مولاناؒ اللہ تعالیٰ کے عرش پر مستوی ہونے کے قائل ہیں لیکن کسی مخصوص جہت کے نہیں۔ جبکہ امام تُستریؒ نے اس پر کلام نہیں کیا۔

13- ید اللہ پر امام تُستریؒ نے جمہور کی طرح تاویل کی ہے اور اس سے بیک وقت بہت سے معانی مراد لیے ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ کا حکم، اس کا احسان اور اس کی نُصرت وغیرہ۔

14- دونوں تفاسیر کی اکثر مباحث میں مماثلت پائی جاتی ہے جبکہ بعض جگہوں پر دونوں الگ الگ رائے رکھتے ہیں۔

حوالہ جات وحواشی

1 سورۃ الاخلاص 3:112

2 تفسیر تُستری، امام تُستریؒ، سہل بن عبد اللہ، (دار الحرم لتراث) ط:2004، ص335

3 سورۃ اعلیٰ 1:87

4 تفسیر تُستری، ص310

5 تفسیر تُستری، ص176

6 تفسیر تُستری، ص209

7 سورۃ البقرۃ 115:2

8 تفسیر بیان القرآن، تھانویؒ، اشرف علی، مولانا (لاہور: مکتبہ رحمانیہ) ج:1، ص88

9 سورۃ الاعراف 54:7

10 تفسیر بیان القرآن، ج:2، ص31

11 دیکھیے تفسیر بیان القرآن، سورۃ یونس:3، سورۃ الرعد:2۔ سورۃ طٰہٰ:5

12 سورۃ الفتح 10:48

13 تفسیر تُستری، ص251

14 سورۃ القصص:88

15 سورۃ الانبیاء 103:21

16 تفسیر بیان القرآن، ج2، ص504

17 سورۃ کہف:25:18

18 تفسیر بیان القرآن، ج2، ص413

19 سورۃ یونس 68:10

20 سورۃ البقرۃ 255:2

21 تفسیر بیان القرآن، ج:1، ص184

22 سورۃ کہف 109:18

23 **تفسیر** تُستری، ص191

24 تفسیر تُستری، ص335

25 تفسیر تُستری، ص89

26 سورۃ الاخلاص 4:112

27 تفسیر تُستری، ص335

28 سورۃ النصر 3:110

29 تفسیر بیان القرآن، ج2، ص181

30سورۃ یونس10:26

31سورۃ النساء3:153

3232 تفسیر بیان القرآن، ج:1، ص426

33سورۃ الانعام5:103

34سورۃ الاعراف7:143

35 تفسیر بیان القرآن، ج:2، ص57

36ایضاً

37ایضاً

38سورۃ النجم53:16-18

39 تفسیر تُستری، ص262

40سورۃ زخرف43:69-70

41سورۃ المطففین83:15

42ایضاً:36

43 تفسیر تُستری، ص306

44سورۃ الشعراء26:23

45 تفسیر بیان القرآن، ج:3، ص39

46سورۃ العنکبوت:29:43

47 تفسیر تُستری، ص217

48سورۃ الزمر39:67

49 تفسیر تُستری، ص235

50المنقذ من الضلال، غزالی، ابو حامد، غزالی، (دار البیروت) ج:1، ص523

51سورۃ محمد47:38

52سورۃ النحل16:74

53 تفسیر بیان القرآن، ج:2، ص347

54سورۃ الاعراف7:180

55 تفسیر تُستری، ص154

56 تفسیر تُستری، ص85

57 سورۃ البقرۃ2:54

58 تفسیر بیان القرآن، ج:1، ص56

59 سورۃ النساء3:171

60 تفسیر بیان القرآن، ج:1، ص435

61 سورۃ المائدہ5:17

62 سورۃ البقرۃ2:40

63 تفسیر تُستری، ص95

64 سورۃ طٰہٰ20:46

65 سورۃ البقرۃ2:256

66 تفسیر بیان القرآن، ج:1، ص185

67 سورۃ المائدۃ5:55

68 تفسیر تُستری، ص138

69 سورۃ البقرۃ2:165

70 مشکوۃ المصابیح، خطیب، شیخ ولی الدین، ابو عبد اللہ، (لاہور، مکتبہ رحمانیہ) کِتَابُ الْاِیمَانِ، ح:30

71 مقالات الاولیاء، مرزا قلیچ بیگ (شکارپور: سندھ پرنٹنگ پریس، نوشہری دروازہ) ۱۹۲۷ء ص:۱۵

72 تفسیر تُستری، ص87

73 سورۃ الغاشیۃ88:17

74 تفسیر تُستری، ص312

75 سورۃ الانعام6:52

76 تفسیر تُستری، ص141

77 سورۃ البقرہ2:165

78 تفسیر بیان القرآن، ج:1، ص117

79 سورۃ البقرۃ2:165